عین رشید خان

آبنوسی خیال

دوستوں اور نیک
لوگوں کے لئے

جملہ حقوق

بحقِ نسیم خان، فرح خان، سنبل احمد محفوظ

کتاب کا نام : آبنوسی خیال

شاعر کا نام : عین رشید

سالِ اشاعت : ۲۰۰۱ء

تعدادِ اشاعت : بارہ سو

کمپوزر : مقصود حسن۔ نیو ایشین پرنٹرس۔

29/7۔ فیرس لین، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۷۳۔

پرنٹر : بمل کے دتا۔ اے او پی (انڈیا) پرائیوٹ لمیٹیڈ۔

127/1۔ اے جے سی بوس، روڈ۔ کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۴

پبلشر : بیگم نسیم خان۔ فلیٹ 47۔ بلاک V،

25/1A۔ گڑیاہاٹ روڈ ، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۲۹

تقسیم کار : عثمانیہ بک ڈپو۔ 125/ رابندرا سرانی، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۷۳

قیمت : Rs. 100/-

تـــرتـــیـــب

نـــــظمیں

چند باتیں

آج ہم بے حد خوش ہیں کہ عین رشید کا مجموعۂ کلام ''آبنوسی خیال'' ان کے قدردانوں کی نذر کر سکے۔ آج ہم بے حد مغموم ہیں کہ یہ کتاب رشید کی زندگی میں پیش نہ کی جا سکی۔

مرحوم بار بار مجموعے کی کتابت کرواتے رہے، بار بار اس کے اوراق گم کرتے رہے، ایک پریس سے چھپوانے کی بات بھی پکّی کر لی تھی۔ کچھ مال مسالہ بھی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر حسبِ عادت کام روک دیا گیا۔ نہ وسائل کی کمی تھی نہ کارکنوں کا قحط، مگر نہ جانے کیوں کتاب کی طباعت کا وقت ٹلتا رہا اور آخر کار وہ گھڑی آ پہنچی جب رت جگوں کا ساتھی سب کو جاگتا چھوڑ کر ابدی نیند سو گیا اور ''آبنوسی خیال'' کی اشاعت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

شوہر کی اچانک موت سے بیگم رشید پر کوہِ غم ٹوٹا، مگر صبرِ جمیل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ یہ تہیہ کر لیا کہ مرحوم کی شعری تخلیقات کتابی شکل میں جلد از جلد ادب نوازوں تک پہنچا دی جائیں۔

ہر چند کہ بیگم صاحبہ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور علمی ادبی ذوق بھی رکھتی ہیں۔ تاہم تن تنہا سینکڑوں رسالوں، کتابوں اور کاغذات کے انبار سے مرحوم کی گم شدہ نظموں کو ڈھونڈ نکالنا، پھر ان کی ترتیب، تزئین، کتابت، طباعت اور اشاعت کے صبر آزما مرحلوں سے گذرنا محترمہ کے لئے ہفتوں طے کرنے سے کم دشوار نہ تھا۔ یہ مشکل آسان کر دی مس راکھی چکرورتی نے، ورنہ ہندی اور اردو رسم الخط میں بیک وقت کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہو سکتی۔

جناب احمد سعید ملیح آبادی 'مدیرِ روزنامہ آزاد ہند' کلکتہ کے مفید مشوروں نے ہمیں راستہ دکھایا۔ نیو ایشین پرنٹرز کے مالک جناب مقصود حسن نے ٹائپ سیٹنگ کی ذمہ داری سنبھال کر ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا۔ شری بمل دت (اے۔ او۔پی، انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ) نے طباعت کے بکھیڑوں سے ہمیں نجات دلادی۔ سرورق کی حسن کاری شری سنیل شیل کے خلوص کا عطیہ ہے۔ ہم چاروں حضرات کے شکر گذار ہیں۔ السٹریشن کے لئے ہم وسیم آر۔ کپور اور پرکاش کر موکار کے ممنون ہیں۔

اس مجموعے میں شامل سب نظمیں (سوائے آخری نظم کے) ہند وپاک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو کر سندِ اعتبار حاصل کر چکی ہیں۔

یہ تو نہیں معلوم کہ کس 'کافر' نے پہلے یہ "مذہبِ عشق" اختیار کیا یعنی اردو میں نثری نظم نگاری کی طرح ڈالی لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس اجنبی صنف کو مقبولِ انام بنانے کا سہرا عین رشید کے سر ہے۔ ہم نے مرحوم کو نثری نظمیں سنا کر مقامی اور بیرونی مشاعرے لوٹتے دیکھا ہے۔

شاعر اور کلام شاعر کے تعارف کے لئے انتظار حسین، شمش الرحمان فاروقی ،ڈاکٹر مظفر حنفی اور خاکسار کے مضامین شاملِ کتاب ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ خوب صورت شاعر کا حسین مجموعہ کلام بنگلہ کی طرح (مرحوم کی زندگی میں اس کتاب کا بنگلہ ترجمہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے) ہند وپاک کے ہندی اور اردو حلقوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

بیگم عین رشید کا بہت بہت شکریہ۔ راکھی چکرورتی کو بہت بہت دعائیں۔

کلکتہ۔

۱۵ر نومبر ۲۰۰۰ء اعزاز افضل

عین رشید اور ان کی شاعری

عین رشید کی نظمیں کہتی ہیں، باطل ہے یہ خیال کہ تنقید اصول وضع کرتی ہے اور شاعری ان پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سفر طے کرتی ہے۔ تخلیق کی دنیا میں روزِاوّل سے ہوتا آرہا ہے کہ فنکار نے اپنے خونِ جگر سے فن پارے تخلیق کئے اور نقّاد اپنے فیتے ترازو لیکر آگیا۔ ناپ تول کر، ٹٹول کر، چکھ کر، سونگھ کر اور جانے کن کن طریقوں سے آزمانے کے بعد نتیجے برآمد کئے کہ اس چوکور فریم میں فٹ بیٹھنے والی نگارشات اچھی ہیں اور جو اس پیمانے پر پوری نہیں اترتیں وہ ناقص ہیں۔ پیمانوں سے بے نیاز تخلیقات جنم لیتی ہیں اور تنقید انہیں چھانٹ چھانٹ کر اچھے برے کے زمرے میں درج کرتی رہتی ہے۔ پھر کوئی نقّاد آتا ہے، اپنا نیا سانچہ ڈھالتا ہے اور برے زمرے کی بہت سی چیزیں اس پر کھری ثابت ہوتی ہیں۔ پھر نیا شاعر، کھرا شاعر، ایسی شاعری پیش کرتا ہے جو سابقہ کسی سانچے پر فٹ نہیں ہوتی اور تنقید ایک نیا، پھر ایک اور نیا سانچہ بنا کر اسے محصور کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس لئے صاحبانِ ذوق کو تنقیدی سانچوں پر بہت زیادہ انحصار نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ ادب اور شعر کی دنیا میں ہمیشہ دو اور دو چار نہیں ہوتے۔

یادش بخیر! پہلے صرف پابند نظمیں کہی جاتی تھیں پھر معرّا نظمیں وجود میں آئیں۔ کچھ آگے چل کر ترقی پسندوں اور حلقۂ اربابِ ذوق والوں نے آزاد نظم کو رواج دیا اور چشم بدور آج کل نثری نظم کا چلن عام ہے۔ بادی النظر میں زیرِ بحث نظمیں بھی نثری لگتی ہی۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو میں پابند نظم کی روایت اتنی چھتنار ہے کہ اس کے سائے میں نثری نظم ٹھٹھری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ ہندی میں کھڑی بولی کی پابند شاعری کا سرمایہ بہت محدود ہے (وہاں اچھی پابند شاعری دراصل برج، اودھی، راجستھانی وغیرہ بولیوں میں نظر آتی ہے) اس لئے کھڑی بولی میں اردو آمیز نثری نظم کے لئے وہاں فضا زیادہ ہموار ہے۔ بایں ہمہ میں عین رشید سے کہتا رہا ہوں کہ جب نثری نظم تمہاری آواز میں سنتا ہوں (ساقی فاروقی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے) تو وہ اچھی لگتی ہے، دل کو چھوتی ہے، شاید یہ تمہاری شخصیت کا جادو ہے، ڈرامائی انداز میں پیش کش کا کمال ہے۔ لیکن اب پیش لفظ قلم بند کرتے ہوئے ان نظموں کو عروضی خورد بین سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حقیقی معنوں میں انہیں نثری نظم نہیں کہا جاسکتا۔ یہ پوری طرح آزاد نظمیں بھی نہیں ہیں۔ کلیتاً معرا بھی نہیں اور پابند تو ہرگز نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کسی خانے میں سیدھے سبھاؤ پوری طرح فٹ نہیں ہوتیں۔ ڈھرے سے ہٹی ہوئی نظمیں ہیں یہ۔

کہتے ہیں فن شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ آیئے اس آئینے کو سامنے رکھ کر دیکھیں ان نظموں کو۔ عین رشید کے روز و شب سے واقفیت رکھنے والوں میں طرح طرح کے لوگ ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ عین رشید بے حد خلیق اور شریف آدمی ہے۔ کسی کے نزدیک وہ ششماہی بچّے کو دودھ کے وعدے پر چھ ماہ تک زندہ رکھ سکتا ہے۔ کوئی اسے شاعر کی حیثیت سے پہچانتا ہے، کوئی اس کی سیر چشمی کا مداح ہے تو کسی کے خیال میں عین رشید ایک رندِ لاابالی ہے۔ ایک صاحب اسے انتہائی ذمہ دار افسر قرار دیتے ہیں تو دوسرے اسے زیرک مبصر اور منفرد فلم ساز کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ موسیقاروں سے سنا کہ عین رشید کو موسیقی کے رموز و نکات میں درک حاصل ہے۔ ظاہر بینوں کے لیے یہ تمام باتیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر تابناک شخصیت ہیرے کی طرح بہت سے پہلوؤں سے ترشی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ وہ گفتگو کے فن سے آشنا اور آواز میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے ہنر سے آگاہ ہے۔ ادائیگی میں کمال رکھتا ہے،

بیک وقت اردو، انگریزی، پشتو، فارسی، ہندی اور بنگلہ جیسی پانچ بڑی زبانوں پر عبور رکھتا ہے اور عمر کی اس منزل میں خوبرو اور دلکش، وجیہہ اور جامہ زیب ہے۔ایسی پہلو دار شخصیت کا فن یک رخا کیسے ہو سکتا ہے۔اس کی سوچ پہلو دار ہے، نظمیں بھی پہلو دار ہوں گی۔

شخصیت کے اس آئینے کے سامنے رکھنے پر رمز کھلا کہ عین رشید کی نظمیں بیک وقت پابند، معرا، آزاد اور نثری نظمیں ہیں۔ مثال کے طور پر "سمندر کا خیال" سے کچھ مربوط اور غیر مربوط مصرعے دیکھئے:

اپنا گھر اجنبی سا لگتا تھا — ہر طرف ابتری کا منظر تھا
ایک لکنت زدہ سی ویرانی — در و دیوار پہ تھی حیرانی
یہ حسیں وادیاں اس سے مانوس تھیں — سب حسیں وادیاں یک بیک سو گئیں (پابند)

کتنی مایوس تھی قریب تھی وہ / جیسے ساحل ہو اک سمندر سے / اس کی تصویر اس کے ہلتے لب / سارے منظر ہیں زیرِ آب کہیں / اک تلاطم کے بعد سر کنڈے / شام کے دودھیا دھندلکوں میں / تنہا تنہا اداس پھرتا ہے / ناامیدی کی نیلگوں چادر / اک سمندر سی پھیل جاتی ہے / رات جب سسکیوں میں ڈھلتی ہے / پھر سمندر کی یاد آتی ہے۔(معرا)

روکتے تھے اس پیمائشِ ویرانی سے / صبح سے کیوں یہ سمندر کا خیال ذہن میں آج تھپیڑے مارے / جیسے پاتال میں چھپ جاتے ہیں / شام کے دودھیا دھندلکوں میں (آزاد)

وہ کہ سویا ہے یا کہ جاگا ہے / کہر آلود بند دریچوں میں / جب وسیع کائنات چھپتی ہے / جیسے ساحل ہو اک سمندر سے (معرا)

اس کی رخصت مانندِ پرواز
آج پھر زیرِ دل
ایک معصوم خواہش کی شدت نہ ہو

پھر کسی ادھ جلے خواب کی جستجو تو نہیں
تتلیاں سبز و نیلی
سر پھرے رقص و بو کے جہاں
کتنی مانوس و سرشار ہیں

نظم کے ابتدائی نو مصرعوں میں لمسیہ، بصری، سمعی اور شامی پیکر ایک دوسرے سے آمیز ہو کر کتنے حسیاتی لہرے بناتے ہیں اور ان میں کتنے معنیاتی ابعاد ابھرتے ہیں! میں زیادہ مثالیں پیش کرنے سے گریز کروں گا کہ یہ نظمیں اتنی گٹھی ہوئی اور منٹو کے افسانے کی مانند حشو و زوائد سے اتنی پاک ہیں کہ مکمل صورت میں ہی لطف دیتی ہیں اور ان میں سے اقتباس تراشتے ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہرن کی آنکھیں طشتری میں پیش کر کے ناظرین کو انہیں خوبصورت کہنے پر مجبور کیا جائے۔

یہ سچ ہے کہ عین رشید Oral Tradition پر یقین رکھتے ہیں اور نظم پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ نہیں بلکہ خود نظم اپنے آپ کو ادا کر رہی ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ نظم خوانی اور ادائیگی کی مشق بھی عین رشید نے خوب بہم پہنچائی ہے۔ لیکن ان خصوصیات اور کمالات کو بروئے کار لا کر نیاز حیدر یا وامق جونپوری جیسے شاعروں کی نظموں میں جان نہیں ڈالی جا سکتی۔ بیشک عین رشید کی کچھ نظمیں بیانیہ ہیں مثلاً شہر، بیڑیاں، آبنوسی خیال وغیرہ۔ لیکن بیانیہ اسلوب کے باوصف عین رشید کی ادائیگی کے دوران ایسا لگتا ہے جیسے ایک نظم کے بطن سے دوسری اور دوسری کے بطن سے تیسری نظم بر آمد ہو رہی ہے۔ غالب نے غزل کے تعلق سے کہا تھا

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

یہ قول عین رشید کی نظموں پر بھی چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ جن میں علامات کے

لاشعوری اور لفظوں کے شعوری التزام نے معنوی پرتیں ڈالی ہیں۔ اب یہ سننے اور پڑھنے والے کے تجربات کی وسعت اور احساسات کی اثر پذیری پر منحصر ہے کہ وہ بالائی سطح کے علاوہ اور کتنی معنیاتی پرتوں تک پہنچتا ہے۔ یہ نظمیں جن میں سے مختصر ترین "۳۱/ دسمبر" چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور طویل ترین "شہر" پانچ Composition میں پھیلی ہوئی ہے۔ نہ صرف اعتبار سے ہی پابند، معرّا، آزاد، نثری، مختصر اور طویل کی حد بندیوں کو توڑتی اور کاٹتی، ہیں بلکہ موضوعات و مواد کے اعتبار سے بھی مختلف اصنافِ سخن کو ایک دوسرے میں آمیز کرتی ہوئی پائی جاتی ہین۔ مثلاً "شہر" "آبنوسی خیال" وغیرہ جدید افسانے کی یاد تازہ کرتی ہیں تو "سیب" اور "مصور" "تاریخ کی الٹی طرف" وغیرہ میں "داستانوی فضا" سانس لیتی ہے۔ "ہم وہاں دیر سے پہنچے"، سفر نامے کا مزا دیتی ہے۔

ایک اور سال بیت گیا اضطراب کا

ایک اور شام ڈھل گئی بے چینیوں کی آج
ایک اور دن کی شام کسی طرح ہو گئی
"کچھ دے دلا کے حال کو ماضی بنا لیا"

اوّلین دونوں مصرعوں میں لفظ "اور" کی نشست پر غور کیجئے۔ عام شاعر اسے پہلے مصرعے میں سال، اور دوسرے مصرعے میں "شام" کے بعد استعمال کرتا لیکن ظاہر ہے اس صورت میں شعر کا لہجہ اتنا کاٹ دار نہ رہتا۔ "دے، دلا، حال اور لیا" میں دال اور لام کی کار فرمائی بھی توجہ طلب ہے۔ عین رشید نے ان دونوں مصرعوں کو بھی آخری دونوں مصرعوں کی طرح نثری ساخت میں ڈھالا ہوتا تو یہ نظم نیم نثری، نیم معرّا ہو جاتی جبکہ موجودہ شکل میں تمام مصرعے بھرپور غنائیت کے حامل ہیں۔ تیسرا اور چوتھا مصرعے نثری ساخت میں ہونے کے باوجود سہل ممتنع کے حامل غزل کے شعر کی طرح چٹخارہ دیتے ہیں اور پہلے دو مصرعے ہلکی سی مروڑ کھا کر کیسی ترنم ریز اور اثر انگیز ہو گئے ہیں۔ یہ سب

لفظوں کے التزام کی کارفرمائی ہے۔ آتش نے شاعری کو مرصع ساز کا کام کہا ہے۔ ہمارے دور کے نظم نگاروں میں مرصع سازی کا سلیقہ عین رشید سے بہتر بہت کم شاعروں کو آتا ہے۔ نظمیں تو نظمیں ان کے کم و بیش ہر مصرے میں لفظوں کا التزام اور فقروں کا دروبست، بحر، قافئے اور ردیف کی تکرار سے آزاد رہ کر بھی الفاظ و تراکیب کے صوتی آہنگ سے گونجتا محسوس ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ دوسرے نظم گو اکثر ترکیب سازی کے پھیر میں پڑ کر بے سُرے ہو جاتے ہیں۔ لیکن عین رشید کی نظموں میں ''نیلی تاریکی، شگفتہ قہقہے، بے ساز وسعت، غسلوں کے خواب، تاریخ کا شاطرانہ صحن، لکنت زدہ ویرانی، بے نوا چیخ،، زخمی پرندے جیسی برق، چنگھاڑتی دھوپ، ندامت کے روزے اور ایسی ہی سینکڑوں نادر ترکیبیں ملیں گی جو تازگی اور شگفتگی کی مظہر ہیں اور سر تا سر نئی ہونے کے باوجود نظموں میں اس طرح گھلی ملی ہیں کہ غرابت کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔

عین رشید کی وہ نظمیں جن میں جملوں کی ساخت نثر سے زیادہ قریب ہے (شہر کے سلسلے کی تمام نظمیں، سیب اور مصور، ہم وہاں دیر سے پہنچے، قسطوں میں خواب، لوری وغیرہ) نو بہ نو حیاتی پیکروں سے آباد ہیں اور یہ پیکر جامد نہیں اور ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ واضح حکم لگانا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ پیکر مثال کے طور پر بصری ہے، سمعی ہے یا لمسیہ ہے۔ دیکھئے ان کی نظم ''بیمار گڑیا'' کے مصرعے۔

کہ شاید خزاں چھو گئی ہے اسے
آج خاموش ہے
چل کے دیکھیں کہیں
اس کی رخصت مانندِ پرواز
بکھر اس موج جیسے ساحل کی گود میں آ کر ہی دم لیتی ہے۔
ایک طوفانِ پیہم ہوائیں خروش (علیحدہ بحروں میں آزاد)
اپنی دہلیز پر کھڑا انتہار لرزتے آنسو اور دکھتا ہوا سر (نثری)

اچھی خاصی نظم کے بخیے ادھیڑنے پر، ہمارے ہاتھ یہ نکتہ لگا کہ اس نظم کے بیشتر مصرے پابند ہیں / معرا ہیں / یا آزاد ہیں۔ اٹھائیس مصروں پر مشتمل نظم کا محض ایک مصرع ایسا ہے جس کو قافیے، ردیف اور بحر کی دیواروں نے قید نہیں کیا۔ ایسی صورت میں اسے نثری نظم کیسے کہا جا سکتا ہے۔ تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو عین رشید کی دوسری نظموں کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ خود شاعر نے اپنی نظموں کو کہیں نثری نظم کا نام نہیں دیا لیکن کچھ ناقدین کا فنِ کرشمہ ساز انہیں نثری نظم کہتا ہے۔ حالاں کہ جس طرح عین رشید کی شخصیت میں بیک وقت مختلف شخصیتیں گھلی ملی ہیں۔ اسی طرح اس انوکھے شاعر نے اپنی نظموں کو بھی بیک وقت پابند، معرا، آزاد اور نثری ہیئت عطا کی ہے۔ کچھ لوگ اسے عجزِ شاعرانہ سے منسوب کریں گے۔ لیکن انہیں یاد رکھنا ہوگا کہ اردو شاعر کے بابا آدم امیر خسرو (خالق باری) سے لیکر ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی (پرچھائیاں) تک متعدد شعرا نے اس تکنک سے کام لیکر اپنی ایک ہی تخلیق میں مختلف بحریں استعمال کی ہیں۔ عین رشید اس ہیئتی تجربہ گاہ میں اپنے پیش رووں سے کئی قدم آگے نکل جائے تو کم از کم اس کے کامیاب تجربوں کو سراہنا چاہیے۔

اس ضمن میں چند اور امور بھی لائق غور ہیں۔ میں نے اردو غزل کا پچاس سالہ انتخاب "روحِ غزل" مرتب کیا تو عین رشید سے بھی غزلوں کی فرمائش کی۔ جواب ملا وہ غزل نہیں کہتے۔ پوچھا کیوں؟ کہا غزل میں موسیقی کے صرف پانچ سُر لگ سکتے ہیں (میں موسیقی میں شدبد نہیں رکھتا اس لئے اصطلاح نادرست ہو سکتی ہے) ایسی نظمیں کہتا ہوں جن میں ساتوں سُر شامل ہو سکیں۔ لیجئے نقاد کہتا ہے عین رشید نثری نظم لکھتا ہے اور عین رشید کے بقول ان کی نظموں میں غزل سے زیادہ موسیقیت ہے۔ وہ چوں کہ موسیقی کے گیانی ہیں اس لئے ان کی بات کو دھیان سے سننا ہوگا، ان مسئلے پر ان سے تفصیل سے گفتگو کے بعد مجھے ان کے خیال سے متفق ہونا پڑا کیوں کہ وہ کم از کم پانچ بڑی زبانیں جانتے ہیں اور ان میں سے تین زبانوں (اردو، انگریزی اور بنگالی) میں تخلیقات بھی پیش کرتے ہیں نیز

موسیقی کے رموز و نکات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ان کا قول ہے کہ کسی بھی دوسری زبان کے مقابلے میں اردو کے الفاظ زیادہ صوتی اور غنائیت رکھتے ہیں۔اگر ان الفاظ کو سلیقے اور صوتیاتی التزام کے ساتھ برتا جائے تو جملہ خواہ بحر میں ہو یا محض نثری فقرہ،اس میں ترنم اور جھنکار ضرور ہو گی۔اس زاویے سے دیکھتا ہوں تو ان نظموں میں سے پہلا دائرہ، رات اور صبح، سرکش،اور ۳۱/ دسمبر وغیرہ عین رشید کی تائید میں ہاتھ اٹھائے نظر آتی ہیں۔ آخر الذکر چوں کہ مختصر ترین ہے اس لئے مثال کے طور پر درِ خواب اور زرد پتے، فنطاسے سا تاثر دیتے ہیں جبکہ رات اور صبح دلدوز ٹکڑوں میں بٹا ہوا ایک منظوم موتاژ ہے!

موضوعات و مواد کے اعتبار سے بھی تنقید ان نظموں کو کلاسیکی، ترقی پسند یا جدید نظموں کے گروہوں میں نہیں بانٹ سکتی۔الفاظ کے صوتیاتی نظام، جملوں کی تراش خراش اور فارسیت سے التباس ہوتا ہے کہ ان میں کلاسیکی نظم کی شان ہے۔ان کی مقصدیت اور عوام سے محبت کے جذبے سے سرشار، عام زندگی کے مسائل، تصنع سازی، منافرت، فرقہ واریت کے خلاف یہ نظمیں جس طرح صف آراء ہیں ان میں جو بلند آہنگی اور طنز کی کاٹ ہے ان کے پیشِ نظر ان پر ترقی پسندی کا لیبل بھی چسپاں کیا جاسکتا ہے اور تجریدی اسالیب و علامتی طرزِ اظہار نیز پیچیدہ احساسات کی ہفت پہلو عکاسی انہیں نئی نظموں کی صف میں داخل کرتی ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر یہ سارے رنگ عین رشید کی نظموں میں بے حد نفاست سے بندھے اور گندھے ہیں۔اس لئے سب لیبل ان پر سے ہٹا کر قارئین کو انہیں کھلے اور آزاد ذہن سے پڑھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا مشورہ دینا چاہئے۔ان کے مطالعے کے دوران یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ عین رشید کی شاعری نہیں ہے بلکہ یہ مختلف نوعیت کی نظمیں ہیں۔یہ ن۔م۔راشد کی طرح یک لخت جست لگا کر سامنے آجانے اور چونکانے کے بجائے بند کنول کی طرح آہستہ آہستہ کھلتی ہوئی نظمیں ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑوں کو چن کر اور مرتب کر کے دیکھیں تو اس میں ایک نیم واضح شکل نظر آتی ہے۔ کبھی اپنی شکل تو کبھی غنیم کی۔ عین

رشید کی نظمیں بھی کچھ ویسا ہی نقشہ پیش کرتی ہیں لیکن وہ اس حد تک علاماتی اور بند بند چھوئی موئی کی طرح اپنے آپ میں لپٹی ہوئی تخلیقات بھی نہیں کہ ملارمے یا کافکا کی نگارشات کی یاد تازہ ہو جائے۔ عین رشید نے غالباً حضرت علیؓ کا یہ قول دل پر نقش کر رکھا ہے کہ سلامتی کی راہ انتہاؤں پر نہیں بلکہ ان کے بین بین ہیں۔ میں یہ بات نقاد کی حیثیت سے نہیں عین رشید کے ایک ہم عصر شاعر کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے اردو نظم کے ہونٹوں پر نئے رجحانات اور نئے اسالیب کا تازہ رس نچوڑا ہے اور ان کی کاوشوں کے طفیل نظم کا شہر اپنی فصیلوں سے آگے دور تک بہت دور تک پھیل رہا ہے۔

۲۵ر نومبر ۱۹۹۴ء

کلکتہ یونیورسٹی، پروفیسرز کوارٹر،
کانکڑ گاچھی، کلکتہ

مظفر حنفی
(پروفیسر اقبال چیئر و صدرِ شعبۂ اردو)

عین رشید

کوئی بائیس چوبیس برس کی بات ہے۔ میرے پاس کچھ نظمیں چھپنے کے لئے آئیں۔ آہنگ میں بڑی تازگی تھی، کچھ نثر و نظم کا ملا جلا انداز تھا، پیکروں اور فقروں میں عجب آزادانہ لہر سی تھی جیسے کسی مشاق مصور نے موٹے قلم یا برش سے لکیریں کھینچ دی ہوں۔ جو بظاہر بے ربط لیکن بہ باطن بامعنیٰ ہوں۔ شاعر کا نام تھا ع۔ رشید اور پتے پر اے۔ آر۔ خان، پولس آفس لکھ کر بنگال کے کسی ضلعے کا نام تھا۔ یہ بات تو صاف تھی کہ پولس میں تحقیقات یا خرافات کرنے والا یہ شاعر کوئی منشی یا محرر تو نہ تھا، لیکن یہ بات بھی واضح نہ تھی کہ وہ ہے کون۔ اس بات کا امکان تھا کہ اس نے اپنا عہدہ رتبہ ازراہِ کسر نفسی چھپایا ہو یا پھر اس لئے کہ مجھ پر اس کی افسرانہ حیثیت کا اثر نہ پڑے اور نظموں کو میں ان کی قیمت پر تولوں، مصنف کی افسرانہ میزان پر نہیں۔ مجھے امید تھی کہ اوّل الذکر بات ہی ہوگی کیوں کہ جو لوگ میرے بارے میں تھوڑا بہت بھی جانتے ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ میں عہدے اور حیثیت کے تام جھام سے مرعوب نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ بات تو صاف تھی کہ نئی نظم کے افق پر ایک نیا ستارہ روشن ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً جواب لکھا کہ نظمیں چھپ جائیں گی اور یہ بھی عرض کیا کہ اردو میں ن۔ م۔ راشد کی طرح کا نام اور کسی کو راس نہ آیا۔ کیوں نہ آپ اپنا نام عین رشید یا عین الرشید رکھ لیں؟ میری یہ درخواست قبول ہوئی۔ شاعر کا نام عین رشید قرار پایا اور دھیرے دھیرے یہ بات بھی کھلی کہ عین

رشید سپرنٹنڈنٹ پولس وغیرہ ہیں۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کے عاشق ہیں اور اس کی نظمیں تقریباً اسی لہجے میں زبانی سنا سکتے ہیں۔ نظمیں بھی چھپی تو مقبول ہوئیں اور مجھے خوشی ہوئی کہ جدید شاعروں کی فہرست میں ایک نیا نام داخل ہوا۔

برسوں بعد عین رشید کو پڑھنے والوں اور سننے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہوں نے بہت جلد نئی شاعری میں ایک منفرد آواز، ایک تازہ احساس اور ایک حساس روح کی شعری کیفیت کا اضافہ کیا۔ پھر ان کی توجہ مختلف چیزوں میں بٹ گئی۔ شاعری کم ہوتی گئی، شعر گوئی سے تو ان کا دل ہٹنے لگا اور فلم، موسیقی، ٹی وی، دوستی، بزم آرائی یہ سب آگے آتی گئیں۔ میں دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہا۔ جعفر علی خان اثر مرحوم کی طرح یہ تو نہ کہہ سکتا تھا کہ اردو ادب میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کا رنج ضرور رہا کہ وہ نئی آواز جو جدید اردو ادب کا حصہ بنتی، مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ آج جب عین رشید کا مجموعہ چھپ رہا ہے تو جہاں خوشی ہو رہی ہے وہاں اتنی کم (اور بعض ان میں بے حد مختصر) نظمیں دیکھ کر رنج بھی ہو رہا ہے کہ اتنے عرصے میں سو بھی نظمیں نہ ہو سکیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ضخامت میں کم ہونے کے باوجود یہ مجموعہ بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ اس میں برسوں کی فکر، صدیوں کے احساس اور ان گنت ساعتوں کے مطالعے کا نچوڑ نظر آتا ہے۔ یہ کہنا آسان ہے کہ یہ نظمیں بے حد بصری اور بے حد سمعی ہیں یعنی ان کو پڑھتے وقت نہ صرف وہ مناظر تصور میں نظر آتے ہیں جن کے لئے بصری پیکر استعمال کئے گئے ہیں، بلکہ وہ آوازیں، وہ ارتعاشات بھی سنائی دیتے ہیں جن سے وہ مناظر عبارت ہیں۔ ان نظموں کو پڑھتے وقت جو کیفیت حاصل ہوتی ہے وہ کچھ ایسی ہے گویا آپ کسی دو منزلہ کے چھجے پر کھڑے ہوں، نیچے دھوپ کی معتدل روشنی ہے اور آپ آتے جاتے سب مناظر، تمام ٹھہری ہوئی اور مرتعش چیزوں کو صاف صاف دیکھ رہے ہوں۔ عین رشید خود ان نظموں میں اور ان مناظر میں پوری طرح رچے بسے ہوئے ہیں لیکن وہ آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کرتے، آپ کو دور ہی سے دیکھتے رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو

قسطوں میں خواب، سمندر کا خیال، کون ہے تو، تاریخ کی الٹی طرف جیسی نظمیں وجود میں نہ آتیں۔

مغربی ادب کے مطالعے کا اثر عین رشید کے کلام میں کیمیائی عمل کی طرح ہے، سطح پر نہیں۔ پھر بنگالی اور جدید اردو نظم کی روایت بھی ان نظموں میں بول رہی ہے۔ یہ نظمیں ایک ساتھ پڑھی جانے کا بھی تقاضا کرتی ہیں۔ کم شاعر ایسے ہوں گے جن کی حسیت اس درجہ مرتکز اور منضبط ہو کہ ان کی کئی نظمیں مل کر ایک اکیلی نظم بناتی ہوں اور ہر نظم کسی ایک ذہنی وقوع کی ترجمان بھی ہو۔ عین رشید سے میں بس اتنا ہی کہتا ہوں کہ اور لکھو، اپنا حق لو اور اردو کا حق ادا کرو۔ میر عبدالحئی تاباںؔ۔

تو ہرگز چھوڑیو مت شعر کہنا
کہ تاباں نام رہتا ہے سخن سے

شمش الرحمٰن فاروقی

الہ آباد

۱۶؍فروری ۱۹۹۶ء

غالب اور عین رشید

غالب کی تخلیقات کا بنگلہ ترجمہ بنگالی ذہنوں کو متاثر کر رہا ہے۔ اور اب یہ ترجمہ سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس اطلاع کے لئے میں اپنے دوست مسعود اشعر کا ممنون ہوں جو کلکتہ میں ہونے والی غیر سرکاری ہندپاک دانشوروں کی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد وطن واپس آئے ہیں۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ برِ صغیر میں پُر امن ماحول پیدا کرنے کے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ ایک سو ساٹھ دانشوروں کے اس قافلے میں لاہور کے کچھ ادیب بھی شامل تھے۔ یہ کارواں بذریعہ ریل کلکتہ کے لئے روانہ ہوا تھا۔

واپسی پر ٹی ہاؤس میں ان لوگوں نے ہندستانی Adventure کی کہانیاں سند باد اسٹائیل میں سنائی۔ انیسویں صدی کے کلکتہ کی دلچسپیاں غالب کے شعروں میں اچھی طرح اجاگر ہوئی ہیں۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ کلکتہ نے اپنی اس دلچسپی کا بہت کچھ حصہ کھو دیا ہے۔ جو غالب کے زمانے میں تھیں۔ اب یہ برِ صغیر کا شاید سب سے زیادہ گنجان اور حد سے زیادہ آلود شہر ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لاہوری گروپ بہت متاثر ہو کر لوٹا۔ اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مسعود اشعر نے بنگالی ادیبوں سے اپنے تبادلہ خیالات کے بارے میں مجھ سے بتایا کہ یہ ادیب اپنی اردو ادب سے لاعلمی پر متاسف تھے۔ اس کے باوجود بھی ایک چیز دیکھنے میں آئی کہ غالب کو حالیہ دنوں

میں بنگلہ میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ مترجم عین رشید ہیں جنہوں نے شاعری کے دلدادہ بنگالی عوام میں غالب کا تعارف پیش کیا۔

عین رشید کی بنگلہ کتاب میں غالب کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط کا انتخاب بھی شامل ہے۔ جس کی گرم جوشی کے ساتھ پذیرائی کی گئی ہے۔ یہ کتاب تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے جبکہ پچاس ہزار صرف بنگلہ دیش میں فروخت ہوئی ہیں۔ جب بنگلہ دیش مشرقی پاکستان تھا تو غالب نے بنگالیوں کو متوجہ نہیں کیا۔ غالب کو کلکتہ سے ہو کر بنگلہ دیش پہنچنا نصیب تھا۔

عین رشید انڈین پولس سروس سے منسلک ہیں اور کلکتہ میں مقرر ہیں۔ وہ اردو بنگلہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ بنگلہ ان کی مادری زبان ہے۔ وہ بنگلہ کے شاعر ہیں اور اردو جدید نظمیں لکھتے ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں بلراج منیرا کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے شعور میں شائع ہو چکی ہیں۔ عین رشید نے مسعود اشعر کو یہ بھی بتایا کہ غالب بنگالیوں میں کم مشہور نہیں ہیں۔

مسعود اشعر نے ایک بنگالی شاعر سے پوچھا تھا کہ عین رشید کے ترجمے کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں۔ اس شاعر نے کہا کہ ''اردو سے نابلد ہونے اور غالب کو نہیں پڑھنے کی وجہ سے میں اس ترجمے پر اپنی رائے دینے سے قاصر ہوں۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ غالب کا جو سرمایہ بھی پاس ہے وہ سچی شاعری ہے اور اپنی انفرادی خوشبو رکھتی ہے۔''

ہم جانتے ہیں کہ جب غالب ہندی میں چھاپے گئے تو یہ کامیاب اقدام تھا۔ پھر بھی ہندی کا بنگلہ سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندی چونکہ لسانی اعتبار سے اردو سے تعلق رکھتی ہے اس وجہ سے اس میں غالب کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے غالب کی شاعری کو بس ناگری رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فارسی تراکیب

اور دبیز ابہام کے باوجود بھی ہندی سرکل میں غالب نے شہرت حاصل کرلی۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ ہندستانی تہذیبی ماحول میں غزل کی پذیرائی غالب کی وجہ سے ہی ہے۔

لیکن بنگالیوں تک پہنچنے کے لئے غالب کو بنگلہ ترجمے کی ضرورت تھی۔اور شاعری کا ترجمہ ایک مشکل کام ہے۔ کسی بھی شاعری میں کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا ہوتا ہے جو کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔اس کے باوجود بھی ہم نا قابلِ ترجمہ کو بھی ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اوراس طرح ہم ترجمہ شدہ شاعری کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی پڑھتے ہیں کہ اس کام میں بہت کچھ گم ہو چکا ہے۔

درحقیقت ایک تخلیقی ترجمہ ہی اچھی شاعری کے گریز کو کچھ حد تک سمیٹ سکتا ہے۔اور یہ یقیناً پڑھنے والوں کو ایک مختلف زبان کے شاعر اور مختلف شعری روایت سے آگاہ ہونے میں مدد کرتا ہے۔ عین رشید خود ایک شاعر ہیں اور ان سے ایسے ترجمے کی امید کی جاسکتی ہے۔ بنگالیوں میں غالب کی شہرت کی یہی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

انتظار حسین

ڈان میگزین۔پاکستان

مورخہ ۲۴/جولائی ۱۹۹۷ء

عین رشید کا داغِ مفارقت
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اس کے ہاتھ پارس تھے، قلم پارس تھا، زبان پارس تھی۔ وہ سراپا پارس تھا۔ جس کو چھوا سونا بنا دیا۔ نثری نظمیں کہیں تو ان کی قیمت بڑھ گئی۔ مضمون لکھے تو اس کے دام آسمانوں کو چھونے لگے۔ تقریر کی تو ایسی گرمیٔ گفتار ہوئی کہ بس۔ افسری کی تو عہدہ اپنی بلندیٔ قسمت پر ناز کرنے لگا۔ دوستی کی تو اس کو تقدس کے منصبِ جلیلہ پر فائز کر دیا۔ فلم ''ساتواں آدمی'' بنائی تو اس کی شہرت ساتویں آسمان تک گئی۔ امیر خان پر سیریل بنایا تو موسیقی ''آفریں، صد آفریں'' کہنے پر مجبور ہو گئی۔ بسم اللہ خاں کا انٹرویو لیا تو شہنائی گُن گنانے لگی۔ ''شطرنج کے کھلاڑی'' کی بساط پر ستیہ جیت رائے کو مات کھانے سے صاف بچا لیا۔ بنگالیوں کو کلامِ غالبؔ کا ایسا چسکا لگا دیا کہ ان کی زبان آج تک چٹخارے لے رہی ہے۔ غزل کو خون کی طرح ان کی رگ وپے میں دوڑا دیا۔ ڈائرکٹر اس کا لوہا مانتے تھے۔ اداکار اس کو گرو جانتے تھے۔

خاندان کی آنکھوں کا تارا، احباب کا دلارا، ضرورت مندوں کا سہارا، بجیلا ایسا کہ کتنی زلیخاؤں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں، مگر نہ دامن چاک ہوا نہ پاک دامنی پر آنچ آئی۔ اونچے لوگوں کے سامنے سر اٹھا کر گیا۔ نیچے والوں سے جھک کر ملا۔ اعلیٰ ترین منصب تک پہنچا مگر بالائی آمدنی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ سینہ کدورت سے پاک، خزینہ

دولت سے خالی۔دل محبت کے جذبے سے لبریز۔ذہن فکر و شعور کے نور سے معمور۔ سیکولرزم کی جان، مگر سچا مسلمان۔کھرا انسان۔خالص پٹھان۔

"چاندنی" کی دھوپ میں تپا۔مولانا آزاد کالج کلکتہ سے بی اے آنرز (انگریزی) کی ڈگری لی۔ آزادی کے بعد وہ پہلا مسلمان تھا جس نے مغربی بنگال سے آئی پی ایس کے کل ہند مقابلہ جاتی امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ نکسلی دور میں حواس باختہ پولس فورس کو اپنی دلیرانہ قیادت سے نیا حوصلہ بخشا۔وہ پہلا مسلمان افسر تھا جس کو کلکتہ میں ڈی سی ڈی ڈی بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔وہ عہدوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر عہدے اس کے پیچھے بھاگتے گئے۔ آخر ڈائرکٹر جنرل کی کرسی نے اس کو جگہ دے کر اپنا رتبہ بلند کیا۔

ہمایوں کبیر اور پروفیسر اے ۔ڈبلو۔ محمود کے بعد مسلمانوں میں ایسا نابغہ روزگار کاہے کو پیدا ہوا ہوگا۔بنگال کے مسلم معاشروں میں نہ شاعروں کی کمی ہے، نہ عالموں کی، نہ دانشوروں، کی اگر کمی ہے تو ایسے اشخاص کی جو غیر مسلم حلقوں میں ہمارے مذہب، زبان، ادب اور تہذیب کی نمائندگی کا حق ادا کر سکیں۔جو ہر حلقے میں قابلِ قبول ہوں۔بیسویں صدی کے آخری دہائیوں میں اگر یہ فریضہ کسی نے ادا کیا ہے تو بلاشبہ وہ ذات ہے عین رشید کی۔مرحوم نے انگریزی اور بنگلہ پر وہ قدرت حاصل کی تھی کہ ہم اردو پر بھی ایسی دسترس حاصل کر سکتے تو اپنی خوبیٔ قسمت پر ناز کرتے۔اس کے لہجے کی مردانہ کھنک،اور گفتگو کا ڈرامائی انداز سامعین کو ایسا مسحور کرتا تھا جیسے بنگال کا چلتا جادو۔اللہ ری اس کی سج دھج، جلسوں کی شان بڑھانے والا، مشاعروں میں جان ڈالنے والا، محبوب، مقبول اور ہر دلعزیز، باادب، بااخلاق، باتمیز۔

اللہ نے مرحوم کو بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ان میں ایک خصوصی نعمت کا نام نسیم خان (بیگم رشید خان) ہے۔ شوہر لا ابالی ،بیگم ذمہ دار۔رشید خان خانہ داری کے

معاملے میں کورے، نسیم سگھڑ، سلیقہ مند، مہمان نواز، متواضع۔ صبح ہے تو چائے ناشتہ حاضر، دوپہر ہے تو دستر خوان آراستہ، نہ امیر وغریب کی تفریق، نہ اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز، اڑدلی اور چپراسی تک کو ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر کھلانا اس اعلیٰ ظرف خاتون کا معمول رہا ہے۔ شوہر کی دیکھ بھال، خانہ داری کے کام کاج، بچیوں کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ کے فرائض اس طرح انجام دئے کہ کوئی مرد بھی کیا دیتا۔ کبھی شوہر کی سرکاری گاڑی استعمال نہ کی۔ ہمیشہ پیدل یا ٹرام، بس اور ٹیکسی پر سفر کرتی رہیں۔ ڈائرکٹر جنرل کی وائف، نہ باڈی گارڈ نہ سیفٹی آف لائف۔

نئی نویلی تھیں تب بھی، بال بچے دار ہوئیں تب بھی۔ ساس بنیں تب بھی مشرقی آداب و مذہبی فرائض کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ رمضان میں افطار پارٹی، عید، بقر عید میں دعوتیں اور ضیافتیں کبھی ناغہ نہ ہوئیں۔ رشید کے ماما (جگت ماما) اکثر کہا کرتے "اگر نسیم (بیگم رشید) نہ ہوتیں تو رشید کہیں کے نہ رہتے"۔

ماما کو رشید کی زندگی میں وہی اہمیت حاصل تھی جو راجا بیربل اور تان سین کو دربارِ اکبری میں۔ وہ مرحوم کے ماما بھی تھے، دوست بھی تھے، مشیر بھی تھے، ناصح مشفق بھی تھے۔ ماما سنگیت سمراٹ کا فرض بھی نبھاتے تھے اور پرائیوٹ سکریٹری کی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ سائے کی طرح ساتھ رہتے۔ بعض اوقات رشید کے سی۔اے (C.A) کا رول بھی ادا کرنے لگتے۔ ایک دن رشید نے اطلاع دی کہ "اب آپ کے دوست یعنی ماما "اوپر" جانے والے ہیں۔ پاؤں میں ورم آگیا ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ ماما جانے سے پہلے اطلاع ضرور کر دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سرکاری دورے پر رہوں اور تم سفر عدم پر روانہ ہو جاؤ"۔

ماما نے تو عدم کا سفر ملتوی کر دیا مگر رشید بغیر اطلاع کیے ہوئے اپنی آخری منزل کی طرف چل پڑا۔ کس کو معلوم تھا کہ موت سے چند روز پہلے ٹمیا برج کے مشاعرے میں "آخری نظم" کے عنوان سے جو نظم پڑھی تھی وہ اس کی آخری نظم ٹھہرے گی۔

ارے ظالم کوئی اس طرح بھی بھرا پُرا گھر چھوڑ کر جاتا ہے؟ نہ ماں کی فریاد سنی، نہ بچیوں کی آہ و زاری پر کان دھرا، نہ بھائی بھتیجوں کی آہ و بکا پر توجہ دی۔ نہ احباب کی سسکیوں کا احساس، نہ پولس کی آخری سلامی کا پاس۔ نہ عیادت کی زحمت دی، نہ تیمارداری کی تکلیف۔ "آبنوسی خیال" کے چھپنے تک کا انتظار نہ کیا۔ اٹھے اور چپکے سے امیر خان مرحوم کے پہلو میں جا لیٹے۔ رشید! تم تو بہت رحم دل تھے دوست! اچانک اتنے کٹھور کیسے ہو گئے؟

جس کے دم سے تیری دنیا مصر کا بازار تھی
اے زلیخائے سخن تیرا! وہ یوسف مر گیا
افسری، دانشوری، تیشہ زنی، شیشہ گری
جو فرائض اس کے ذمے تھے وہ پورے کر گیا

۱۷ ستمبر ۲۰۰۰ء

پروفیسر اعزاز افضل

عین رشید ایک نظر میں

نام	:	عین رشید خان
تاریخ پیدائش	:	یکم فروری ۱۹۴۲ء (سرکاری)
		۹/ نومبر ۱۹۴۴ء (اصلی)
یوم وفات	:	۱۰/ ستمبر ۲۰۰۰ء
تعلیم	:	بی اے (آنرز)
پیشہ	:	آئی پی ایس (۱۹۶۵)
آخری عہدہ	:	ڈائرکٹر جنرل آف پولس (ایچ۔ جی)
پتہ	:	فلیٹ ۷ ۴/۔ ۱/ ۲۸ گڑیاہاٹ روڈ، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۲۹

تصانیف اور ترجمے

۱۔ جدید اردو شاعری۔ ناشر : آینہ من، لنڈن۔ ۱۹۷۲ء

۲۔ غالب کے اشعار کا بنگلہ ترجمہ۔ ۱۹۷۵ء ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء

۳۔ بنگلہ میں عین رشید کی نظموں کا ترجمہ۔ ۱۹۹۲ء

۴۔ جاوید اختر کے مجموعہ "ترکش" کا بنگلہ ترجمہ۔ ۱۹۹۷ء

۵۔ روزانہ اسٹیٹسمین میں تبصرے اور مضامین

فلمیں

۱۔ "استاد امیر خان"۔ پانچویں برسی پر ایک ڈاکومنٹری فلم جو ۱۳ر فروری ۱۹۷۹ء کو دوردرشن کے سب اہم اسٹیشنوں سے بیک وقت دکھائی گئی۔

۲۔ "ساتواں آدمی"۔ (ہندستانی مسلمانوں پر فلم) ۱۹۸۱ء

یہ فلم Leipzig فلم فیسٹول ،انڈین پنورا ما سیکشن ۱۹۸۲ء ،فیسٹول سنیما ،(پیرس) لنڈن فیسٹول میں دکھائی گئی۔

۳۔ گوتم گھوش کی فلم Meeting A Mile stone کی اسکرپٹ لکھی اور کمنٹری دی۔ یہ فلم Cannes فلم فیسٹول میں افتتاحی فلم کی شکل میں دکھائی گئی۔

۴۔ گوتم گھوش کی ۱۹۹۴ء کی انعام یافتہ فلم "پتنگ" کی اسکرپٹ لکھی۔

۵۔ گوتم گھوش کی فلم Beyond the Himalayas (۱۹۹۵) کے لئے کمنٹری دی جو B.B.C. Discovery Channel اور دوردرشن سے دکھائی گئی اور NewYork کے فلم فیسٹول میں بہترین ڈاکومنٹری ایوارڈ سے نوازی گئی۔

۶۔ گوتم گھوش کی فلم "گڑیا" (۱۹۹۶) میں سنواد لکھا۔

اس فلم کو بہترین ہندی فلم کے لئے ۱۹۹۷ء میں ایوارڈ دیا گیا۔

۷۔ WHO کے لئے کینسر پر گوتم گھوش کی فلم "شام ہی تو ہے" (۱۹۹۲-۹۴) کے اسکرپٹ اور کمنٹری کا کام انجام دیا۔

۸۔ وبھوتی بھوشن بندھوپادھیائے کی کہانی پر گوتم گھوش کی ٹیلی فلم "فقیر" (۱۹۹۸) کی کمنٹری لکھی۔

۹۔ غالب کے دو سو سالہ جشنِ پیدائش کے موقع پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ساہتیہ اکاڈمی میں منعقد ہونے والے جلسوں اور سیمیناروں کو کور کر کے گیارہ گھنٹے کی فلم بنانا شروع کی تھی۔ اس فلم کے اسکرپٹ رائٹر اور ڈائرکٹر عین رشید خان تھے۔ یہ فلم اب تک نامکمل ہے۔

اہم براڈ کاسٹ

۱۔ آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی سے مسلسل مختلف عنوانات پر مضامین اور تقاریر نشر کرتے رہے۔

۲۔ کلکتہ شہر پر ایک فیچر بنام ''شہر'' بنایا جسے آل انڈیا ریڈیو کے دو اہم مراکز سے آل انڈیا انعامات ملے۔

۳۔ استاد امیر خان اور ان کے ترانوں پر ایک فیچر۔ اسے بھی نیشنل ایوارڈ ملا۔

۴۔ بی بی سی سے دو اہم موضوعات پر Talk نشر ہوئی۔

۵۔ کلکتہ میں اردو پر ایک چار گھنٹے کا فیچر اور ستیہ جیت رائے کے ساتھ ۱۶ گھنٹے کا انٹرویو۔

۶۔ FM پروگرام میں مسلسل فیچر براڈ کاسٹ کرتے رہے۔

۷۔ دوردرشن نے عین رشید کی حیات اور کارناموں پر ۳۵ منٹ کی ایک فلم ''صاحبِ فن'' کے نام سے بنائی۔

۸۔ ساہتیہ اکیڈمی کی مطبوعہ who is who of Indian writers (۱۹۹۰، ۱۹۹۳)۔ اور تازہ شمارے میں عین رشید کا نام شامل ہے۔

نظمیں

ہم وہاں دیر سے پہنچے

ہم وہاں دیر سے پہنچے
مگر ہم سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا
عقلمند لوگ تھے
ورنہ ایسی بات ہوتی کہ
کوئی کولمبس سے پوچھے کہ وہ دو گھنٹے دیر سے کیوں آیا
وہ دن اس سال کا آخری دن تھا
اور ہمارے سفر کا پہلا
نینداور سفر سے ماؤف
ہمارے جسموں میں
غسلوں کے خواب تھے
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر
تم عزیز ہو؟
یا تمہارے ماتھے پہ چمکتا تابدار ستارہ
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر ہمیں ایک ندی نظر آئی

جو ہماری گاڑی کی طرح
بے دلی سے سمندر کی طرف جا رہی تھی
ہماری گاڑی کی بے دلی گھنٹوں میں
غصے میں تبدیل ہو گئی
پہیے گرم اور رک گئے
ہم نے کیلوں کے پتوں کے انبار سے
پہیوں کے غیض و غضب سے نجات پائی
ہماری گاڑی اور ندی بے دلی سے
سمندر کی طرف چلتی رہی
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر ہمیں مضبوط جبڑوں والے قدیم لوگ نظر آئے
جن کے اجداد نے پتھر کاٹ کر مندر بنائے تھے
لوگ جو کوٹ نہیں پہنتے تھے اور گوشت نہیں کھاتے
ہم نے وہاں پنکھے چلائے اور سبزیاں کھائیں
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر آثار قدیمہ کے ایک کھنڈر میں
مجھے ایک لڑکی نظر آئی
جو تاریخ کے اوراق سے نکل کر آئی تھی
جی میں آیا قریب جا کر دیکھوں کہیں

اس کے بال سفید تو نہیں ہو گئے
مگر ہمارے ساتھ کتنے لوگ تھے
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر
ہمیں
سمندر دکھائی دیا
سب خوشی سے چہک اٹھے
چہکنے کی بات ہی تھی
سمندر کے اُس پار
دنیا
اور پھر
زندگی

شہر

شہر!
لوگ کہتے ہیں کہ تجھ سے تھک جانا
مر جانے کے برابر ہے
ـــــــاور مجھے بھی کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے............
تو سُن شہر، میں تجھ سے صاف کہہ دوں
کہ میں تجھ سے تھک گیا ہوں.........

یا مجھے یوں لگتا ہے
کہ میرے سر سے اُس باپ کا سایہ اُٹھ گیا ہے
جو اتنے دنوں میری نگہبانی کر رہا تھا............

سُن شہر،
اگر میں مر جاؤں
اور لوگ مجھے دفنانے لے جائیں
تو جھپٹ کے تُو مجھے گود میں لے لینا
اور بال کھولے کہانی والی ماؤں کی طرح
مجھے آنچل میں چھپا کر، چیخ چیخ کر ان سے کہہ دینا:
کہ نہیں...... یہ میرا بیٹا ہے،
میرے جیتے جی یہ کبھی یتیم نہیں ہو سکتا.......!

نہ ہی
میرے جیتے جی کوئی اسے مجھ سے چھین سکتا ہے........!

شہر

شہر، تو اپنے گندے پاؤں پسارے دریا کے کنارے لیٹا ہے
اور تیرے سینے پر رینگتی ہوئی لاتعداد چیونٹیاں سورج کو گھور رہی ہیں
جب نصف درجن غیر ملکی حکیموں نے مشترکہ طور پر اعلان کیا
مرض سنگین ہے اور جلدی ہی مر جائے گا
تو کسی چیچک زدہ بچّے کی طرح تو نے انہیں دیکھا اور خاموش ہو رہا
غلیظ! بدکار! بے رحم!

شہر! لوگ کہتے ہیں کہ تو بدکار ہے
اور میں نے خود دیکھا ہے کہ
سرِ شام
تیرے رنگے چہرے والی عورتیں لڑکھڑاتے نوجوانوں کو نگل جاتی ہیں
بے رحم!

جب رات گئے تیرے دانشور رکشا لئے خودکشی کرنے جاتے ہیں
تو
تُو خاموش ہو رہتا ہے!

شہر، میں تیری دیوانہ کن خواہشوں سے بیزار ہوں
شہر، تُو اَپنے گندے لباس کب اُتارے گا؟
شہر، لوگ کہتے ہیں، مرنے کے بعد میری ہڈیوں سے بٹن بنائیں گے!
شہر، تیری دیواروں پر یہ کیسی تحریریں ہیں؟
شہر، میں نے مہینوں سے اخبار نہیں پڑھا!
شہر، تُو چائے میں شکر ملانا بھول گیا ہے اور اب یہ تیرے آنسوؤں کی طرح لگ رہی ہے!
شہر، مجھے نیند آرہی ہے، تھپک کر سلادے!

شہر

آیئے
ہم اس شہر میں
تجہیز و تکفین کے لئے آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں
ہمارے کارکنوں کی انتظامیہ صلاحیت سارے علاقے میں مشہور ہے
ہمارے گزشتہ گاہکوں کی فہرست طویل، غیر معمولی اور مؤثر ہے
ہمارے مرمریں کتبوں کا جواب نہیں
نوحہ خوانوں کا انتظام بھی ہم ہی کریں گے
دُعائے مغفرت کے لئے بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں
ہمارے کارکن وہاں بھی موجود ہیں
ہم آپ کو یہ بتادیں کہ ہمارے دام معقول اور مناسب ہیں
اور
اس موسم میں
نہایت ہی کم قیمت پر
پاؤں پھیلانے کو
ایک پُر سکون گوشے کی یہ پیش کش صرف
دوستوں اور نیک لوگوں کے لئے ہے

شہر

اس موسم میں یہاں صرف خداؤں کی بود و باش ہے
جو سُرخ ہواؤں اور چنگھاڑتی دھوپ کی زبان سمجھتے ہیں
گمبھیر لے میں گامزن دھوپ
وبا کی طرح گھروں اور بنجر میدانوں میں پھیل گئی ہے
ہر طرف سائیں سائیں کرتی تاریکی ہے
حدِ نگاہ تک
پلکوں پر لرزتے گرم قطروں کے سوا کچھ بھی نہیں

دور
تاریکوں کی ہم سائیگی میں
پالتو اور نیم وحشی کبوتر
فنِ نامہ بری سیکھ رہے ہیں
تاریکی اور حرارت سے مانوس آسیب زدہ لوگ
برق خور کووں کی آواز کے منتظر ہیں!

آبنوسی خیال

نہیں، میری جان فضا خراب ہے تو گاڑی پارک کر دو
باہر جانا مناسب نہیں،
اُداس قہقہوں میں پلے بچّے اب جوان ہو چلے ہیں
اور ہیڈ لائیٹوں کی روشنی میں نت نئے غموں کی ایجاد کر رہے ہیں

ہم اُس مسیحا کی آمد کے آثار کے منتظر ہی رہے
پھر سڑکوں پر چند طوائفیں نظر آئیں
شاید وہ نظر آگیا ہے!
ہاں، ہاں، طوائفوں نے للچائی آواز میں کہا
"چلو ہمیں اپنی گاڑیوں میں لے چلو!"

درخت آبنوسی خیالوں میں مدغم رہے!

جب اُس نے گلے سے لٹکتا مائیکروفون پر کئی دن تک چیخ چیخ کر کہا کہ میں مسیحا ہوں
تو ادارۂ امدادِ باہمی والوں نے اُسے کھانے پر بلایا

کھا پی کر اُس نے تقریر کی
گڑگڑا کر کہا میں مسیحا ہوں مجھے صلیب پر لٹکا دو!
لوگوں نے واپسی کا کرایہ دے کر اسے رخصت کر دیا

اور اُس سال ہماری فصلوں کو ٹڈیاں کھا گییں
اُس سال ہم نے ندامت کے روزے رکھے
اور کھاتے بھی کیا کچھ تھا ہی نہیں!
تمام پیغمبروں اور مسیحاؤں کو جیل سے رہا کر دیا گیا
۳۸۰۰۰ پیغمبر اور ۳۷۶ مسیحا
سڑکوں پر منڈلاتے رہے اور تقریریں کرتے رہے
"انسان کے بیٹو! ہم صدیوں سے ٹوٹی کرچیں چن رہے ہیں
اب اِن کرچوں سے تمہارے لئے ایک نئی کائنات کی تخلیق کریں گے
اور تمہارے ہاتھوں سے اجنبی اسلحہ لے کر پھر سے تمہیں پتھر دے دیں گے!"

اور ٹوٹی کرچیں چبھتے رہے!

وہ بچہ جو ہمیں صبح کا اخبار دے جاتا یک بیک غائب ہو گیا
ہمارے دودھ والے نے بھی آنا بند کر دیا

ہم سب ٹوٹی کرچیں چبھتے رہے

پھر
ایک صبح
وہ لڑکا
صبح کا تازہ اخبار لئے نمودار ہوا
دودھ والا بالٹی لئے دروازے پر کھڑا مُسکرا رہا تھا
جھیلیں پھر بھر دی گئیں!

میرے بعد آ

بدلے گا رنگِ شامِ الم
میرے بعد آ
ہوگا ذرا سا درد بھی کم
میرے بعد آ

تنہائیاں بھی اپنی ہیں
اپنی ہیں ساعتیں
خود ساختہ ہیں سارے یہ غم

میرے بعد آ
خوابوں کی اُس منڈیر سے دیکھا کیے مجھے
یہ اور بات ہے کہ ہوئی چشم میری نم
نمناکیوں کی بات ختم
میرے بعد آ
ہریالیوں کی بھیڑ
مگر دکھ کی کاشت ہے
بدلے گا رنگ چرخِ کہن
میرے بعد آ

قسطوں میں خواب

میں جب چھوٹا تھا
تو چلتے چلتے خواب دیکھا کرتا تھا
اکثر میں صرف خواب دیکھنے کے لئے ہی چلتا تھا
صبح کو، دوپہر کو، شام کو
رات کو گہری نیند سوتا تھا
جو گہرے نیند سوتے ہیں وہ خواب نہیں دیکھتے
سارے خوابوں کا مرکزی کردار میں ہی ہوا کرتا تھا
مگر میرے قریبی اور پیارے لوگ بھی اُس میں شامل رہتے تھے
میرے خواب طویل اور منظوم ہوتے تھے
اور میں اکثر اُن میں ترمیم کیا کرتا تھا
کچھ خواب (جو دل کو نہ بھاتے تھے)
انہیں چھوڑ کر نئے خواب کی شروعات کرتا تھا

اب میں رات بھر
اور خاص کر صبح کو

قسطوں میں خواب دیکھتا ہوں
اَدھ جلے خواب
کچھ خوابوں سے نجات ملتی ہے
تو جی خوش ہو جاتا ہے
سارے خواب جانے پہچانے ہوتے ہیں

مانوس خواب
تفصیلی خواب
کچھ خواب روزمرہ تفصیلوں سے واضح
کچھ سُہانے خواب جب رُک جاتے ہیں
تو اُنہیں دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں
خواب خود نہیں دُہراتے

اَن دیکھے خواب
اب خوابوں کی دنیا میں ہیں

بیـــــڑیاں

ہر رات
اک ہجوم
پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کو بے قرار
ہر رات
بیڑیاں
پاؤں کو نگل جاتی ہیں
صرف بائیں کو حرکت کی اجازت ہے
دایاں بیڑیوں میں محفوظ ہے
اگر بیڑیاں پاؤں نہ نگلیں تو
اُن سَروں کا کیا ہوگا جو پاؤں کے بَل کھڑے ہیں؟

۲۰ر نومبر ۱۹۹۱ء

عینی بیٹی ــــــــ دعا

برائے عقیلہ عینی انو بنتِ شمشیر انور

کتنی خوش لگتی ہے تُو
کہ تیرے کوئی سمجھوتے نہیں
تُو خوش رہے یہ سَب کی خواہش ہے
تو خوش رہے گی
مگر
زندگی سے کھیلے گی
یہ دعائیں
یہ دل کی باتیں ہیں
اگر قبول ہوئیں
دنیا میں
تیرا مقام مختلف ہوگا
تُو اِس صدی سے کبھی اُس صدی سے کھیلے گی
مگر
سب سے الگ
یہی دُعا ہے مری
کہ اِس صدی کے گنجلکوں کی گود میں پل کر
تُو اُس صدی کے اُجالوں سے چکاچوند نہ ہو

کِھلے ھیں پھُول پھر

کھلے ہیں پھول پھر

ہر باوفا کو دعوتِ آوارگی پھر ہے

نرم، نیلے پَروں کو پھڑ پھڑانے کی اجازت

دیر تک ہے اب

ذرا کچھ دور ہے

پلکوں سا نیلا

خوبصورت گاؤں

زَرد پتّے

ڈھیر میں
خاموش
سوئے تھے
وہ سب
یک بیک
جُنبش ہوئی
جاگے سبھی
پھر
شرارت سے
ہوائیں
تیرنے، اُڑنے لگے
"ٹھہرو بھائی، کون ہو؟
آئے تھے
کیوں؟
"اور کیوں چلے؟" میں نے کہا
"پتے۔ پتے، پتے ہیں"

اٹھلا کے وہ کہنے لگے
"ہم یہاں
ایک خوبصورت خواب
آنکھوں میں جگائے
سو رہے تھے
کہ کوئی فنکار
سنہرے، زرد اور بھورے رنگوں میں
ڈھال دے ہم کو
کہ
ہر چشمِ بینا کے لئے
جب کوئی آیا نہیں
جاتے ہیں ہم۔"

سمندر کا خیال

اپنی دہلیز پہ کھڑا تنہا
اپنا گھر اجنبی سا لگتا تھا
اس کی رخصت تھی مانندِ پرواز
ہر طرف ابتری کا منظر تھا
ایک لکنت زدہ سی ویرانی
در و دیوار پہ تھی حیرانی
لرزتے آنسو اور دکھتا ہوا سر
روکتے تھے اسے پیمائش ویرانی سے
وہ کہ سویا ہے یا کہ جاگا ہے؟
صبح سے کیوں یہ سمندر کا خیال ذہن میں آج تھپیڑے مارے؟
کہر آلود بند دریچوں میں
جب وسیع کائنات چھپتی ہے
ناامیدی کی نیلگوں چادر ایک سمندر سی پھیل جاتی ہے۔
کیوں یہ رہ رہ کے سمندر کا خیال ذہن میں آج تھپیڑے مارے؟
کتنی مانوس تھی، قریب تھی وہ

جیسے ساحل ہو اک سمندر سے

بے کراں موج جیسے ساحل کی گود میں آ کے ہی دم لیتی ہے

اُس کی تصویر اُس کے ہلتے لب

سارے منظر ہیں زیر آب کہیں

اک تلاطم کے بعد سرکنڈے

جیسے پاتال میں چھپ جاتے ہیں

کیوں یہ رہ رہ کے سمندر کا خیال ذہن میں آج تھپیڑے مارے؟

شام کے دودھیا دھندلکوں میں

تنہا تنہا اداس پھرتا ہے

رات جب سسکیوں میں ڈھلتی ہے

پھر سمندر کی یاد آتی ہے

یہ حسیں وادیاں اس سے مانوس تھیں، اس کی جاگیر تھیں

ایک طوفان پیہم ہوا میں خروش

سب حسیں وادیاں یک بیک سو گئیں

ہم سفر

اک سفر کی شروعات ہو سکتی ہے
تم اگر ہاں کہو، تم اگر ہاں کہو
شاہراہوں میں گلیوں میں بھٹکیں گے ہم
کوئی منزل نہ ہو نہ ہو زادِ سفر
ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر

اور بُننے میں تم کو مہارت تو ہے
خواب بُنتے چلیں گے
ڈگر سے ڈگر
تم اگر ہاں کہو، تم اگر ہاں کہو
ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر

تلخیاں زندگی کی بکھر جائیں گی
اور پر چھائیاں بھی نظر آئیں گی
غم سمٹ جائے گا
رات کڑوے ہلاہل میں گھل جائے گی
تم اگر ہاں کہو، تم اگر ہاں کہ
ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر

۳۱/ دسمبر

ایک اور سال بیت گیا اِضطراب کا
ایک اور شام ڈھل گئی بے چینیوں کی آج
ایک اور دن کی شام کسی طرح ہو گئی
"کچھ دے دلا کے حال کو ماضی بنا دیا"

بیمار گڑیا

کہ شاید خزاں چھو گئی اُسے
آج خاموش ہے
چل کے دیکھیں کہیں
آج پھر زیرِ دل
ایک معصوم خواہش کی شدّت نہ ہو
پھر کسی اَدھ جلے خواب کی جستجو تو نہیں
تتلیاں، سبز و نیلی
سر پھرے رقص و بو کے جہاں سے
کتنی مانوس و سرشار ہیں
اور میں اپنے اچھے خدا سے
کتنی بیزار ہوں
تھک گئی ہوں
چاند تاروں کو چھونے کی خواہش
چوٹیوں تک پہنچنے کی خواہش
ایک بے نغمہ بے ساز وسعت
دل دھڑکنے سے بھی ہچکچائے

صورتِ دود سایہ گریزاں
نیلی تاریکیوں سے شگفتہ
قہقہے مارتی میں جو نکلی
میرے خوابوں کے بیدار چہرے
سارے ساحل پہ نوحہ خواں ہیں

کــون هے تو؟

سایہ میرا مجھکو دیکھ کے بھاگے ہے
پھر بھی میرے ساتھ رہے ہے
کون ہے تو؟

ابھی قربت ہی زیست کا باعث ہے
پھر بھی تجھ سے ڈر ہی لگے ہے
کون ہے تو؟

تجھ کو دیکھ کے پیار سے دل بھر آئے کبھی
دوجے لمحے دل لرجے ہے
کون ہے تو؟

تیرے من کی باتیں من کی باتیں ہیں
پھر بھی من کی بات نہ سمجھے
کون ہے تو؟

راز کی ساری باتیں تجھ سے کرلوں میں
پھر بھی جی کا حال چھپاؤں
کون ہے تو؟

شرم سے سر جھک جائے جب بھی آئے تو
پھر بھی دل کے پاس رہے ہے
کون ہے تو؟

تیری سانسوں کا موسم ہی موسم ہے
غیروں کا موسم ہی لگے ہے
کون ہے تو؟

تجھ کو دیکھ کے لب خشک ہو جائیں کبھی
باتیں کرنے کو دل ترسے ہے
کون ہے تو ہے؟

جھک کے جب بھی دیکھوں اپنی لگتی ہے
پھر بھی مجھ سے دُور رہے ہے
کون ہے تو؟

رات اور صبح

موت کی بو
صرف شمشانوں، قبرستانوں
ہسپتالوں
لوبان یا اگر بتی میں نہیں ہوتی

موت کی بو
آستینوں
اور ناف کے نیچے چھپی رہتی ہے
ہمیں موت کی بھبک
اُس بُڑھیا کی آنکھوں میں ملی تھی
جو اُپنے جوان پوتے کا انتظار
اُن ہیجانی دنوں میں
چوراہے پر کرتی تھی
اور ٹک ٹک ہمیں تکتی اور پوچھتی تھی
کہ بابا کب آئے گا

ہم سب اُس کو دلاسہ دیتے تھے کہ
وہ جلد ہی واپس آجائے گا
حالانکہ ہم جانتے تھے کہ
وہ کہیں اور ہے

گھر کے آنگن میں
اُس نوجوان کی ماں
جو اپنی ساس سے
چالیس سال زیادہ اداس تھی
اُس آنگن میں موت کی بُو تھی

ہم چپ چاپ اُس نوجوان دوست کو تکتے رہے
جس کے بے کار لب اب کچھ نہ کہیں گے
نہ ہی وہ ہماری سرگوشیاں سُن سکے گا

رات

پُرانے دکھوں کی طرح

بے حِس اور زندہ

دُور

خاموشی

کسی بے چین روح کی طرح

چپ چاپ اور سہمی ہوئی

پھر ہم بے بسی اور

عجز وانکسار سے سانس لیتی

رات کو تکتے رہے

زرد پتوں اور فنا سے بنائی ہوئی رات

پھر ایک اضطرابی صبح

(جو یک بیک نازل ہو گی)

اور موت کے پس منظر میں
ہر چیز کو واضح کرے گی
بند دُوکانیں
ہراساں لوگ
سُنسان محلے
سناٹوں
اور بے گھروں کے گھروں میں
موت کی مزید تیاری میں مشغول
موت کی سلطنت کے
جواں مرد سپاہی
موت اُن کی آنکھیں لئے
صبح و شام تک ہمارے ساتھ رہتی ہے
ایک گناہ
ایک بے وقوف جرم
یا ملامتِ ضمیر کی طرح !

سَرکش

باز کی طرح جھپٹا وہ برہم فرشتہ
اُس کے بالوں کو مُٹھی میں جکڑے ہوئے اس سے بولا
”میں تمہارا فرشتہ ہوں سن لو
اَپنے سارے فرائض تم انجام دو گے
میری مرضی ہے یہ
سیہ کاروں، غریبوں، احمقوں سے
ہمیشہ پیار کرنا۔ تم ہمیشہ پیار کرنا
تاکہ جب آئیں انسانیت کے مسیحا
فتح کا سُرخ قالین ان کے لئے
اپنے اخلاق سے تُم بنو
اس سے پہلے کہ تم خود سے بیزار ہو
اُس کی عظمت سے دل کو منوّر کرو
اوجِ عشرت ہے یہ، اوج عشرت ہے یہ
دیرپا، دیرپا، دیرپا، دیرپا
درسِ الفت

دل دھڑکنے سے ہچکچائے
صورتِ دود سایہ گریزاں
نیلی تاریکیوں سے شگفتہ
قہقہے مارتی میں جو نکلی
میرے خوابوں کے بیدار چہرے
سارے ساحل پہ نوحہ خواں ہیں

پہلا دائرہ

ہر طرف رات ہے
پتھریلی رات
بے نوا چیخوں کے سناٹے ہیں
اندھیرا ہے
برقِ بے نور
کسی زخمی پرندے کی طرح
سر پٹکتی ہے، ذرا اڑتی ہے
گر جاتی ہے
سرد آہوں میں پگھلتی ہوئی لرزیدہ ہوا
دست بستہ کسی مجرم کی طرح سہمی ہوئی
کانپتی چلتی ہے دو گام
ٹھہر جاتی ہے
کیسا صحرا ہے یہ
کھوئی ہوئی آنکھوں کا ہجوم
اتنی سونی کہ نظر آئیں

رہ گذارِ حیات

اتنی مغموم

کہ ان پہ زندگی کا گماں

کیسا دوزخ ہے

یہاں ظلم نہیں آگ نہیں

کون سے لوگ ہیں؟

اُمیدوں کی صورت کیا ہے؟

سیب اور مُصوّر

ایک بالکل گول طشتری پر
ایک سیب بیٹھا ہے
اور اُس کے مُقابل
حقیقتوں کا مصور
سیب کی حقیقی تصویر بنانے کی ناکام کوششیں کر رہا ہے
کمبخت سیب ہے کہ رنگوں میں ڈھلتا ہی نہیں
اِس معاملے میں اُس کی اپنی رائے ہے
(ذرا مختلف قسم کی)
مصور پہ رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ
سیب اُس کا دشمن ہے
پھر وہ بے چارہ خیالات کے
نائیلن والے جال میں پھنس جاتا ہے
پھر اُس کے ذہن میں سیب کا ایک درخت اُگتا ہے

پھر جنّت
پھر ہاتھ میں برانڈی کا گلاس لئے سانپ

پھر آدم

پھر حوّا

اور پھر گناہِ اوّل

اور پھر اُسے محسوس ہوتا ہے سیب یک بیک غائب ہو گیا ہے

اور پھر

اُسے نیند آجاتی ہے

کتبہ

چشم و رخسار اشکوں سے نم

پیچھے چلتے رہے

ساتھ لیتا گیا

نیلگوں کا ساج اور درختوں کا قد

(موت پر استاد امیر خاں کی) ۱۳ر فروری ۱۹۷۴ء

ایک لوری ــــ صرف اپنے لئے

آسمان نیلا ہے
دھرتی تو بھرتی ہے
راجا بیٹے
جتنا جی چاہے اب سو جا

خوابوں کی دنیا میں
شہزادی پریاں ہیں
اُن کی پناہوں میں
ان کی ہی بانہوں میں
سیانے بیٹے
جتنا جی چاہے اب سو جا

اسلامی جنتری کا پہلا دن

دال اچھی ہے
لڑکیاں نوری
سخت انداز میں بھی نرمی ہے
مسکرائیں
برق سی ہونٹوں میں
لہراتی ہنسی

کیا ہوا؟ کیسا ہوں میں ؟
اب کوئی دلچسپی نہیں
سہ دہائی کا لاابالی پن
کچھ نہ کچھ تو مشین بولے گی
جسم بولے گا، سانس بولے گی

لمحوں کی خاموشی، تشویش، ہنسی بولے گی
اب اے تصورِ اجل
مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

سب کہ مانوس ہو گئے مجھ سے
چارہ گر اور نورائیں
ساری تفتیشوں میں مشینوں کی زد

ساتویں دن کی دوپہر کو سب
ایسے آئے کہ بیٹی رخصت ہو
ایک ڈاکٹر جو مجھ سے چھوٹا تھا
(اور اس طرح کی زندگی سے واقف تھا) اس نے کہا:
"سہ دہائی کی یہ وحشت، یہ لااُبالی پن
جو تم نے پالی ہے
اس میں ہم ہی نہیں
ہماری مشینیں بھی حیران ہیں"
میں نے کہا۔ "اے چارہ گر
ایک خلش ہی جگر بچاتی ہے
چاہے وہ نیم کش ہو یا وَا آنکھیں"
پھر بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کہا:
"اب بھی سب ٹھیک ٹھاک ہے لیکن
وہ غالبؔ کا ترجمہ ہے کہاں؟"
میں نے دھیمے سے کہا (کسی مجرم کی طرح)
"اب کبھی اس گلی میں نہ بھٹکوں گا
نہ شاعری نہ خط نویسی میں"

دور پہنچی ہے میری رسوائی"

دونوں ہاتھوں کو کاندھے پر رکھ کر اس نے کہا:

"سن شاعر! سن اے حساس بشر!

اے مجرم!

تیری ہے سزا

کہ تجھے معمولی پناہوں میں ہی

جینا ہوگا۔"

کون ہے اپنا ؟

سوچو تو کون ہے اپنا؟

دنیا ساری ان کی دنیا
اپنی دنیا دکھ کی دنیا
سوچو تو کون ہے اپنا؟
سب ہی مگن ہیں اپنے سکھ میں
ہم جیتے ہیں پالے دکھ میں
سوچو تو کون ہے اپنا؟
خوابوں کی دنیا میں اکیلے
ہم ہی نہیں تھے تنہا نہیں تھے

ساتھ تھے اپنے خواب ادھورے

سوچو تو کون ہے اپنا؟

دکھ جب ہم کو دیئے گئے تھے

لوگ ہمارے کہاں گئے تھے

سوچو تو کون ہے اپنا؟

تم بھی یہاں ہو ہم بھی یہیں ہیں

پھر بھی اتنی دوری کیسی؟ کیسی دوری؟

سوچو تو کون ہے اپنا؟

اپنالو اپنالو ہم کو

پیار کے سارے بھوکے ہیں ہم

سنا ہے تم کو ہمدردی ہے

سوچو تو کون ہے اپنا؟

دردِ تبسم

"باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
نکلوں جو سیر چمن آنکھ دِکھاتا ہے مجھے" غالبؔ

"کون اس دردِ تبسم سے بچاتا ہے مجھے
آخری وقت ہے وہ دیکھنے آتا ہے مجھے"

"دمِ تحریر متعین تھے دو فرشتے بھی
دَاد ہمّت کی، کہ وہ آنکھ دکھاتا ہے مجھے"

سر سری طور کہ، ہم اِس جہاں سے گزرے
پھر بھی وہ، دین و دنیا سے ڈراتا ہے مجھے"

میں جگر پار گزروں گا اشاروں سے پرے
وہ کہ ان چاند ستاروں سے ہنساتا ہے مجھے

اپنی خواہش، نہ تمنا، نہ جنبشِ انگشت
آئے اب جسکے لئے اب وہ ستاتا ہے مجھے

حیرتِ فکر سے غافل رہا دل،
پسِ زانوئے آئینہ بٹھاتا ہے مجھے

چُپ رہو

"بے طلب وہ دے رہا ہے چُپ رہو
کچھ کہا تو بات خالی جائے گی"

چُپ رہو، چپ رہو
آنکھ کھولو، چُپ چاپ رہو
اُس کی سنو
یادوں کا دامن پکڑو
گن گن کی آواز سنو
دور پپیہا گاتا ہے
اُس کی سنو،
چپ چاپ رہو
آہستہ، آہستہ چلو
گول سا ایک پتھر دیکھو
لاکھ سال سے چاند ستارے
جس کو دیکھ کے چلتے ہیں
اُس کو دیکھو
کچھ نہ کہو
پھر وہ پتھر اس مٹھی میں آئے گا

پھر تم کو سہلائے گا
دُھنک کے گیت سنائے گا
آنکھیں کھولو
دھیرے چلو، آہستہ چلو
شبنم کے سارے قطرے
اُفق کو جا کے چھو لیں گے
دل میں جگنو جگ مگ جگ مگ گائیں گے
جیسے ہی مٹھی کھولو گے پتھر اُڑ کر
اک طائر بن جائے گا

چُپ رہو، چُپ چاپ رہو
آنکھیں کھولے
مٹھی جکڑے
اُس کی سنو
''کچھ کہا تو بات خالی جائے گی''

مُہرِ سکوت

کچھ ہی دیر بعد میری یہ سواری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی
اور میں اُس کا تنہا اور آخری سوار ہوں گا
مجھے معلوم نہیں، سواری کون لے جا رہے ہیں
شاید کچھ لوگوں سے میں کبھی نہ ملا ہوں
مگر وہ نہایت ہی سنبھل سنبھل کے مجھے لے جا رہے ہیں
جیسے مجھے مدت سے پہچانتے ہوں یا شاید میں نے ضرور کبھی
اُنہیں مسکرانے یا ہنسنے کا موقع دیا ہو گا
وہ گپھا کے دہانے تک نہایت ہی احتیاط سے مجھے لے جاتے ہیں
مگر اب کسی کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں
اب وہ مجھے کوئی تحفہ بھی نہیں دے سکتے
پوٹلی میں زادِ سفر کچھ بھی نہیں

میں ان بے کسوں میں ہوں جنہیں چھڑے پھٹے کپڑے بھی میسّر نہیں
صرف چہرے پر کچھ تحریریں ہیں (خود میرے لکھے ہوئے)
جنہیں کوئی نہیں پڑھ سکتا

اگر زندگی میں اتنے پیچ و خم ہیں
تو میں کیوں کھلی کتاب بنوں؟
نہ ہی میں نے کسی کی زندگی کو واضح طور پر سمجھنے کی کوشش کی
اس خونی صدی میں لکھی تحریریں
خود میرے خون سے لکھی تحریروں پر دل کی دھڑکنوں
کی ساکت مہر ہے
یہ واحد مہر ہے جسے کوئی بھی نہیں توڑ سکتا

تاریخ کی الٹی طرف

نہیں! میں کسی یونانی المیے کا مرکزی کردار نہیں
نہ ہی میں اس لئے بنا تھا....... میں تو ایک خاموش تماشائی ہوں!

ہزاروں سال پتھروں میں جکڑے کسی مرکزی کردار کی آنکھیں
جب شاہین سے نچوائی جاتی ہیں
اور جب وہ درد سے کراہ کر کہتا ہے "میں پیار کرنے والوں کیلئے ایک کربناک منظر ہوں (۱) ! "
یا سالہا سال سمندروں میں بھٹکنے والے سیاحوں سے
خدا جب ان کے گھر آنے کا دن چھین لیتا ہے (۲)
یا جب کوئی سرکش مرکزی یونانی کردار
اپنے آبائی خدا سے مسکرا کر کہتا ہے۔ "تخلیق کے بعد مجھ پر تمہارا کوئی حق نہیں رہا۔ (۳) ! "
تو میں اپنے بغل والے معصوم تماشائی سے
ماچس مانگ کر اپنا سگریٹ سلگا لیتا ہوں "خدایا ! یہ لوگ کتنے بے وقوف ہیں (۴) ! "

مجھے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں
شاید اپنی غلطیوں کو ہنس کر بھولنے کے فقدان کو تجربہ کہتے ہیں،
یا پھر شاید اسی اختلاج کمتری کو ذہن کے فریج میں بند رکھنے کو !
شاید......... مجھے معلوم نہیں !

یہ صدی دردِ زچگی سے کراہ رہی ہے
اور میں تاریخ کے شاطرانہ صحن میں بیٹھا سوچ رہا ہوں
"میں نہیں، یہ دنیا ضعیف ہو گئی ہے اور جلد ہی مر جائے گی۔(۵) !"
مگر مورخین میرے بارے میں کیا لکھیں گے ؟

(۱) ایس کلس، (۲) ہومر، (۳) سارتر، (۴) شیکسپیئر اور (۵) ایذرا پاؤنڈ

نرگس اور باز گشت

ہزاروں سال سے اُسکی بجھی آنکھیں
پُر نم ہیں
اُس مرتعش پیکر کے لئے
جس کا عکس
جھیل کے شیتل جل کی لہروں میں
مرتعش ہے
چمن میں کوئی دیدہ ور پیدا ہویا نہ ہو
بھلا اِس سے اُس کا کیا لینا دینا
اور فضا میں صرف ڈیڑھ جملے گونج رہے ہیں
"غبارِ عشق میں تنہا اُٹھا کے لایا ہوں"
اور بازگشت ..... تنہا اُٹھا کے لایا ہوں"
لایا ہوں ، لایا ہوں

جانا یا نہ جانا

(۱)

اِدھر اُدھر بکھرے درو دیوار
لہروں میں بہتے تنکوں میں
کس کو پکڑوں، کس سے کروں انکار
پیار بھرے خط سارے ٹکڑے ٹکڑے
دل کو تھی تھوڑی سی دل جمعی
ویرانی کے منظر جی نہ لبھائیں

(۲)

آنکھیں لبھاتی ہریالی
بھو کی دُھول
تخریبوں کی تعمیروں میں پربت بھی مشغول
آکاشوں میں میگھ رچیں گھنگھور
پگلی ہوائیں کیوں نہ مچائیں شور
جانہ سکا میں، ہُوا نہ میرا جانا
ہوا نہ میرا جانا، جانہ سکا میں، ہوا نہ میرا جانا
اَن چاہت سے بے چینی تھی کم
جیسے آگ اور پانی
آپس میں مدغم

باتیں بُنتے بُنتے
بنی ایک اور بات
آغوش میں
چھپی ہوئی ایک گھات

(۳)

اُدھ جلی دوپہر
چاند سے جھلسی رات
اِس رستے اور اُس رستے
روزن پُر ات پات
بھوک لگے تو حلق منائے سوگ
املی کے پتوں پر سوئے
ساڑھے سترہ لوگ

گیا پیار سے کوئی ایک بھر مار
کسی نے پھینکے اپنے بس ہتھیار
ملا کسی کو آخری اپنا سپنا
ہو نہ سکا پھر میرا جانا
ہوا نہ میرا جانا

سچ میں جکڑا ابھیمان

کیا انھیں ہاتھوں نے چھوا تھا
نیرا کا وہ چہرہ
جواب گناہوں میں مشغول ہیں؟

شام کی آخری ساعتوں کے گرد آلود برآمدے پر
اسی چہرے پر پڑی تھی
ہمّت کی ایک تابناک روشنی
جیسے ایک ٹیلی گرام
طلسمی نیرا پہ روشن گام
آنکھوں اور بھنووں سے ملی جلی ایک مسکراہٹ
یا اس کی بھنووں سے لپٹے تابدار قطرے
جب اس جوان کو کمسن کہنے کو جی چاہے

(۲)

پھر میں دایاں اٹھا۔ ہوں
مردانے طرف
خود سے کہتا ہوں
قابل ہو
کم از کم
اس قابل ہو
کہ شفقت سے چھولو
نیرا کے چاہِ ذقن

انھیں لبوں نے کہا تھا نیرا سے
کہ مجھ کو تم سے پیار ہے
کیاان لبوں کو
راس آئے گا
کبھی کوئی جھوٹ
زینوں سے اترتے
خیال آیا
کہ ضروری بات تو ہوئی ہی نہیں
ہنس دھونی میں اس لاغر کو
لے اڑیں گی

(۳)

غیر ملکی اجنبی ہوائیں
پھر ایک اَن دیکھے
زلزلے کی پناہوں میں
تمام زینے
یک بیک سہم کر
نیرا کی آنکھیں
پیار کی مختلف صورتیں
جیسے
چاروں اور
مایاؤں کی ڈور
بیچ میں جکڑے ابھیمان
زینوں پہ کھڑا
آنکھیں شعلوں سے بھرپور
انھیں لبوں نے کہا تھا نیرا سے
کہ مجھ کو تم سے پیار ہے
کیا ان لبوں کو
راس آئے گا
کبھی کوئی جھوٹ؟

ماں تم کیوں ناراض ہو مُجھ سے ؟

تم نے کہا تھا
دیکھو بیٹے !
بائیں چلنا
جھک کے ملنا
اچھی باتیں ہیں

میں نے دیکھا
جھک کے ملنا
بائیں چلنا
کیسی باتیں ہوتی ہیں
ماں تم کیوں ناراض ہو مجھ سے

تُم نے کہا تھا خواب نگر کے سارے ستارے
اپنی ڈگر میں آئیں گے

میں نے دیکھا
خواب نگر کے سارے ستارے
کن کی ڈگر میں آئے تھے

ماں تم کیوں ناراض ہو مجھ سے ؟

آخری نظم

"کتابوں کی وجہ سے
میں نے دنیا اور زندگی کو کھو دیا"
اب میں معریٰ اور غیر معریٰ بحروں سے تھک گیا ہوں
پیکر تراشی میں کوئی دلچسپی نہیں
مفلوج استعاروں سے جی گھبراتا ہے
سب مہمل اور بے جان ہیں
دُنیا کی کسی بھی جاندار شے کو (چاہے وہ بڑی ہو یا چھوٹی)
ان بیساکھیوں کی ضرورت نہیں
خوبصورت ترین نظمیں
زندگی کی زندہ اور نسبتاً جاوید خوبصورتیاں چُرانے میں مشغول ہیں
ایک فاختہ سُریلی آواز میں اپنے ہم سفر کو بُلا رہی ہے
یا ایک کوئل کسی سے ملنے کو بے چین ہے
بچے درختوں کے نیچے میلے پھل چُن رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں
سہاگ رات میں کوئی شرما کے اپنی بانہوں میں سمٹ رہی ہے

ایک نوجوان جوڑا
دنیا و مافیہا سے بے خبر

بوس و کنار میں مدغم ہے
اور یہ سب کام میں کسی اُلّو شاعر کی طرح
کاغذ پر کرتا ہوں
اور اسی بیوقوفی نے مجھے
زندگی کی خوشیوں اور پیار کے لمس سے دور دور رکھا ہے
میں نے میلوں لمبی پلاش کی جلتی قطاریں دیکھی ہیں
اور پہاڑوں پر گامزن Orchid کا ہجوم
بارہا میں نے "س" پہ "ش" گاتی کوئلوں کی آواز سُنی ہے
اور خدا معاف کرے
میں نے اپنے پُرکھوں کی بیوقوف پر مپرا کو اپنانے کے چکّر میں
انہیں قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے
اور اپنی ذاتی استعداد کا رعب جمانے کے لئے
ان میں ترمیم کی جدوجہد کی ہے
(اور خدا اس گناہ کو معاف کرے)
میں نے انہیں استعاروں، پیکروں اور اسلوب میں
ڈھالنے کی کوششیں بھی کی ہیں
اور اکثر جب تیری دی ہوئی ذہنی صلاحیت نے ساتھ نہیں دیا..... نعوذ باللہ
تو میں نے بین الاقوامی سطح پر انہیں ڈھونڈ نکالنے کی سر مغزیاں بھی کی ہیں

اور ہمیشہ خود فریبی کی معمولی پناہوں میں

خود کو یہ دلاسہ دیا ہے کہ
جب پھول اور درخت سب ناپید ہو جائینگے
اور نوخیز جوڑے منظر سے سرک جائیں گے
دن گدلا ہو جائے گا اور شامیں ملگجی ہو جائیں گی
تو شیشے کی الماریوں میں بند میرے یہ جلاوطن الفاظ
اُن کہانیوں کو پھر دہرائیں گے
تو اس وقت بھی میں اپنے پُرکھوں اور ہم عصر بیوقوف شاعر کی طرح
کم ذہنی اور مسخرے پن کا مظاہرہ کروں گا
جب سورج سوا نیزے پر ہو گا تو
تو ہر ہوشیار آدمی اور ان گنت بیوقوف شاعروں کی
زبان پر صرف ایک ہی لفظ ہو گا
نفسی اور نفسی
تو پھر کیا؟ اسرافیل کی بے سُری پھونک سے
یہ سُریلی نظمیں بھی جاگ اُٹھیں گی؟

اور خدایا میرے ان مشہور مصور دوستوں کا کیا ہو گا
ان کی درگت کا خیال آتے ہی جی لرز جاتا ہے
(بالآخر تو وہ میرے دوست ہیں)
جو تیری کائنات کے تناسب سے مسحور ہونے کے بجائے
آڑی ترچھی لکیروں میں بے ہنگم انداز میں رنگ پوت پوت کر

انہیں مسخ کر کے من مانی قیمتوں پر بے دھڑک بیچتے ہیں
اور پھر تیری تخلیق کردہ خوبصورت دوشیزاؤں کے لباسوں سے صرف رنگ ہی نہیں
تیری تخلیق کی بنیادوں کی طرف جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں
خدایا ! مجھے یقین ہے کہ
توان کا حساب الگ سے لے گا
خدایا میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ
میں نے انکی ساری تصویریں گھر سے نکال کر پھینک دی ہیں

خدایا معاف کر
اس عظیم شاعر کو جو قرض کی شراب پی کر
تیری تخلیق کی بدنظمی کا ذکر کیا کرتا تھا
خدایا معاف کر
غالبؔ کو، افتخار جالب کو
یا اللہ اگر یہ ساری نظمیں تجھے
یک بہ یک اٹھانے میں کوئی دشواری ہو تو
کم از کم اپنے بندوں پر ایک چھوٹا سا کرم کر دے
کہ ردیف اور قافیہ
جس کا چلن اب دنیا میں صرف دو ملکوں میں ہے
انہیں فوراً اٹھالے
جو باون سال کی طلاق کے بعد بھی

اب بھی نوچ کھسوٹ کرتے رہتے ہیں

خدایا ان کی غیر ازدواجی زندگی بھی خوشگوار نہیں رہی

اب تو اکثر معاملہ آئے دن بمباری اور ہوائی حملوں میں تبدیل ہو گیا ہے

جس سے دنیا کے سارے پڑوسی اور غیر پڑوسی

امیر اور غریب ملک مستفیض ہو رہے ہیں

خدایا میں اور تیرے ان گنت معصوم اور چند برگزیدہ بندے

اس بات پر متفق ہیں

کہ یہ سارا معاملہ ردیف اور قافیہ کا ہے

کبھی اس ملک کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے

تو کبھی اُس ملک کا

خدایا اُس ملک کا حشر کیا ہو گا

جو تیرا نام لے کر

ان گنت معصوموں کو ہلاک کرتے ہیں

اور خدایا، تیرے بے شمار معصوم بندے

یہاں ان کی قافیہ پیمائی سے حراساں ہیں

یا اللہ، تو بیواؤں اور یتیموں کی آہ کے علاوہ بھی نہیں سنائی دیتا

اور انکی جگہ

دو خوبصورت حوریں (جو اب تک صرف مصوروں کے ہاتھ آئیں ہیں)

انسانی شکل میں اُن شاعروں کو بھیج دے

جو ان بیساکھیوں کے سہارے

شہرت کی چوٹیوں پر پہونچنے کے متمنّی ہیں
خدایا میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ
تیری یہ حوریں باعصمت واپس جائینگی
کیوں کہ یہ سب کے سب
نہایت ہی بے ضرر لوگ ہیں
خدایا یہ بھول گئے ہیں وہ گناہِ اوّل اور وہ پرانی بات
یہ بھول گئے ہیں وہ مشہور مقولہ
"کتابوں پر کتابیں لکھ لو پھر بھی کچھ نہیں ہوتا
کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے دو لفظوں میں تاثیر ہوتی تھی"
اور جب میں نئی نظموں کی شہوت کے گھلتے ذائقہ میں مبتلا رہتا ہوں
تو پھر مجھے یک لخت میرے ہم عصر
اُس عظیم ترین تخلیق کار کے حُسن کی یاد آتی ہے
اور اُسکا حُسنِ ظن دیکھو اس کے باوجود کہ اُسے کبھی نیند نہیں آتی
جس نے چودہ سو سال سے کچھ لکھا نہیں"

زیادہ نہیں

اُٹھ اور پھر سے روانہ ہو، ڈر زیادہ نہیں
بہت کٹھن سہی منزل، سفر زیادہ نہیں

بیاں میں اپنے صداقت کی ہے کمی ورنہ
یہ راز کیا ہے کہ اس پر اثر زیادہ نہیں

سنا ہے وہ مرے بارے میں سوچتا ہے بہت
خبر تو ہے ہی، مگر معتبر زیادہ نہیں

جبھی تو خارِ دلِ دوستاں نہیں ہوں میں
کہ عیب مجھ میں بہت ہیں، ہنر زیادہ نہیں

مجھے خراب کیا اس نے، ہاں کیا ہوگا
اُسی سے پوچھئے، مجھ کو خبر زیادہ نہیں

رشیدؔ اپنے لب و لہجہ کو رفو کرلے
کہ ہم سخن ہیں سبھی، چارہ گر زیادہ نہیں

اردو میں جن شاعروں نے نثری اور آزاد نظم کو فروغ دیا، ان میں عین رشید کا نام امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری کی زبان، لہجے کی جھنکار اور شاعرانہ مزاج صرف جدید ہی نہیں بلکہ ان کا اندازِ پیشکش بھی اتنا پُر کشش ہے کہ پڑھنے والوں کے دل ان کی طرف بے ساختہ کھنچنے لگتے ہیں۔ رشید عصرِ حاضر کے شاعر ہیں۔ اس عہد کے کرب کو انہوں نے محسوس کیا اور بالغ نظری سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی شاعرانہ زبان دوسرے شاعروں سے مختلف ہے۔ اور اس کے ایک ایک لفظ پر انفرادیت کی چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔ ☆